ی بدنامی ماتحتوں کو، تو کوئی شہادتیں کیوں بنائے۔ آخر پولیس کو مجبور ہو کر مقدمہ اٹھالینا پڑا۔ طویلے کی بلا بندر کے سر گئی۔ داروغہ تنزل ہو گئے اور نائب داروغہ کا نزائی میں تبادلہ کر دیا گیا۔

جس دن ملزموں کو بری کیا گیا، آدھا شہر ان کا خیر مقدم کرنے کو جمع تھا۔ پولیس نے انہیں دس بجے رات کو چھوڑا، لیکن خلقت جمع ہو گئی۔ لوگ جالپا کو بھی کھینچ لے گئے۔ اس پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور اس کی تعریف کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔

مگر رمانا تھ کی مصیبتوں کا ابھی خاتمہ نہ ہوا تھا۔ اس پر دروغ بیانی کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہو گیا۔

(51)

اسی بنگلے میں ٹھیک دس بجے مقدمہ پیش ہوا۔ ساون کی جھڑی لگی تھی۔ کلکتہ دلدل ہو رہا تھا، لیکن تماشائیوں کا ہجوم میدان میں کھڑا تھا۔ عورتوں میں ونیش کی بیوی اور ماں بھی آئی تھیں۔ پیشی سے دس منٹ پہلے جالپا اور زہرہ بھی بند گاڑیوں میں آ پہنچیں۔

پولیس کی شہادتیں شروع ہوئیں۔ پر ان میں قابل ذکر کوئی بات نہ تھی۔ محض ضابطہ کی پابندی تھی۔ اس کے بعد رمانا تھ کا بیان ہوا، پر اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے پورے ایک سال کی سرگشت کہہ سنائی۔ وکیل کے

پوچھنے پر اس نے کہا۔

''جالپا کی بے نفسی، حق پسندی اور استقلال نے میری آنکھیں کھولیں اور اس سے بھی زیادہ زہرہ کی دلجوئی اور خلوص نے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس طرف سے روشنی ملی، جدھر اوروں کو تاریکی ہی ملتی ہے۔''

اس کے بعد صفائی کی طرف سے دیبی و جالپا اور زہرہ کے بیان ہوئے۔ زہرہ کا بیان بہت ہی پر اثر تھا۔ اس نے کہا: ''میں نے دیکھا کہ جس آدمی کو نشانۂ ستم بنانے کی خدمت مجھے سونپی گئی ہے، وہ خود درد سے تڑپ رہا ہے۔ اسے مرہم کی ضرورت ہے، زخموں کی نہیں۔ جالپا دیوی سے اسے جتنی عقیدت تھی، اسے دیکھ کر مجھے اپنی خودغرضی اور بے غیرتی پر شرم آئی۔ میری زندگی کتنی حقیر، کتنی گری ہوئی اور کتنی شرمناک ہے۔ یہ مجھ پر اس وقت کھلا جب میں جالپا سے ملی۔ اس کی بے غرض خدمت، اس کے مردانہ عزم اور اس کی پاک غریب دوستی نے میری زندگی کی رفتار پلٹ دی۔ میں نے فیصلہ کیا اس آغوش میں، میں بھی پناہ لوں گی۔''

مگر اس سے بھی معرکے کا بیان جالپا کا تھا۔ وہ بیان سن کر حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کے آخری الفاظ یہ تھے: ''میرے شوہر بے گناہ ہیں۔ ایشور کی نگاہ میں ہی نہیں، قانون کی نگاہ میں بھی۔ ان کی تقدیر میں میری نمائش پسندی کا تاوان دیکھنا لکھا تھا، وہ انہوں نے دیا۔ اصلہ خطاوار میں ہوں، جس کے باعث انہیں یہ عذاب جھیلنے پڑے۔ میں مانتی ہوں کہ میں نے انہیں بیان بدلنے کے لیے مجبور کیا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ سچ مچ ڈاکوؤں میں شریک ہوئے اور ان کی شہادت

واقعات پر مبنی تھی، میں انہیں تبدیلی بیان کے لیے ہرگز آمادہ نہ کرتی۔ جن تاریخوں میں میرے شوہر کا ڈاکوؤں میں شریک ہونا بتلایا جاتا ہے، ان تاریخوں میں وہ الہ آباد میں تھے۔ عدالت چاہے تو وہاں کے میونسپل بورڈ کے دفتر سے اس کی تصدیق کر سکتی ہے۔''

عدالت سے سرکاری وکیل سے پوچھا: ''کیا الہ آباد سے اس معاملہ کوئی رپورٹ مانگی گئی تھی؟''

سرکاری وکیل نے کہا: ''جی ہاں! مگر ہمیں معلوم ہوا کہ ملزم ڈاکوؤں میں شریک نہ تھا۔ اب صرف یہ امر رہ جاتا ہے کہ وہ مخبر کیوں بنا؟''

سرکاری وکیل نے کہا: ''خود غرضی کے سوا اور کیا سبب ہو سکتا ہے؟''

صفائی کے وکیل نے جواب دیا: ''میرا دعویٰ ہے کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ اسے پولیس سے خائف ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے تو اسے دھمکیوں سے مجبور کیا گیا۔''

اس کے بعد سرکاری وکیل نے بحث شروع کی: ''جناب والا! آج آپ کے ہاں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا ہے جیسا خوش قسمتی سے بہت کم ہوا کرتا ہے۔ آپ کو جنگ پور کی ڈکیتی کا حال معلوم ہے۔ جنگ پور کے قرب و جوار میں متواتر کئی ڈاکے پڑے اور پولیس کے عملے مہینوں اپنی جان ہتھیلی پر لیے ڈکیتوں کی تلاش میں سرگرم رہے اور آخر ان کی کوشش بار آور ہوئی اور ڈاکوؤں کا سراغ ملا۔ یہ لوگ گھر کے اندر بیٹھے ہوئے پاک گئے۔ پولیس نے یکبارگی سب کو گرفتار کر لیا، لیکن آپ جانتے ہیں ایسے معاملوں میں پولیس کے لیے عدالتی ثبوت پہنچانا کتنا مشکل ہے۔

عوام جان کے خوف سے، شہادت دینے کا موقع آیا تو صاف نکل گئے۔ پولیس اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان آتا ہے اور ڈاکوؤں کا سرغنہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ ان وارداتوں کا اتنا مضبوط اور مفصل ذکر کرتا ہے کہ پولیس کو اس پر یقین آ جاتا ہے۔ وہ اس موقع پر اس آدمی کو پا کر غیبی امداد سمجھتی ہے۔ یہ آدمی الہ آباد سے کسی معاملہ میں ماخوذ ہو کر بھاگ آیا تھا اور یہاں بھی کون مرتا تھا۔ اس میں اور کوئی صفت ہو یا نہ ہو، موقع شناسی کی صفت ضرور ہے۔ اس کے برعکس فائدے بیشمار تھے۔ پولیس اس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے اور اسے اپنا مخبر بنا لیتی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ ان وارداتوں کی کوئی شہادت نہ پا کر پولیس ڈکیتی کے ملزموں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی، لیکن یہ غیبی امداد پا کر اس نے مقدمہ چلانے کا ارادہ کیا۔

لیکن ایسا ہوتا ہے کہ اس اثنا میں اسے تقدیر سازی کے دوسرے مواقع ہاتھ آ گئے۔ ممکن ہے مغویانہ جماعتوں سے اسے ترغیبیں ملتی رہی ہوں اور ترغیبوں نے اسے مطلب براری کا نیا راستہ دکھایا ہو۔ یہاں دولت کے ساتھ نیک نامی بھی تھی۔ واہ واہ بھی تھی اور قوم پروری کی شہرت تھی۔ یہ شخص اپنی غرض کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔ ہم خوش ہیں کہ بالآخر اس کی حق پسندی اس پر غالب آئی۔ چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں۔

بے گناہوں کو سزا دلوانا پولیس کے لیے اتنا ہی قابل اعتراض ہے جتنا گناہ گار کو چھوڑ دینا۔ وہ اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے ہی ایسے مقدمہ نہیں چلاتی۔ اس جوان کی ابلہ فریبیوں سے پولیس کو جو بدنامی ہوگی اور سرکار کے جو روپے خرچ

ہوئے، اس کی اسے معقول سزا ملنی چاہیے۔ ایسے دروغ بانوں کو آزاد رہ کر سوسائٹی کے ٹھگنے کا موقع دینا صریح بے انصافی ہوگی۔ اس کے لیے سب سے موزوں مقام وہ ہے، جہاں اسے کچھ دن تہذیب نفس کا موقع ملے۔ شاید اس خلوت میں اس کا ضمیر بیدار ہو۔ آپ کو محض یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے پولیس کو دغا دیا یا نہیں۔ اس تفیح کے صحیح تسلیم کرنے میں اب کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ اگر پولیس نے اسے دھمکیاں دی تھیں، تو وہ پہلے ہی عدالت میں اپنا بیان واپس لے سکتا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دھمکیوں کا الزام بالکل غلط ہے۔ اس نے جو کچھ دیا اپنی رضا و رغبت سے کیا۔ ایسے آدمی کو اگر سزا نہ دی گئی تو اس کی شعبدہ بازیوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔''

اس کے بعد صفائی کے وکیل نے جواب دیا: ''یہ مقدمہ انگریزی تاریخ ہی نہیں شاید دنیا کی تاریخ انصاف میں اپنی نوعیت کا بے مثال مقدمہ ہے۔ رمانا تھ ایک معمولی طبقہ کا آدمی ہے۔ اس نے تعلیم بھی معمولی درجہ کی پائی ہے۔ وہ اونچے خیالات کا آدمی نہیں ہے۔ الہ آباد کی میونسپلٹی میں وہ کئی سال ملازم رہ چکا ہے۔ وہاں اس کا کام چونگی کے روپے وصول کرنا تھا۔ عام دستور کے مطابق وہ تاجروں سے رشوت بھی لیتا ہے اور اپنی آمدنی کی پروا نہ کر کے اناپ شناپ خرچ کرتا ہے۔ آخر ایک دن میزان میں غلطی ہو جانے کے باعث اسے شک ہو جاتا ہے کہ کچھ سرکاری رقم اس کے تصرف میں آ گئی ہے۔ وہ اتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا اور گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں دفتر میں اس پر شبہ ہوتا ہے کہ اور اس کے کاغذات کی جانچ ہوتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی

بے جا تصرف نہیں کیا، صرف میزان کی غلطی تھی۔''

اس کے بعد اس نے رما کے پولیس کے پنجے میں پھنسنے، فرضی مخبر بننے اور شہادت دینے کا ذکر کر کے سلسلۂ بحث جاری کیا:

''اب رما ناتھ کی زندگی میں ایک نیا تغیر، جو کہ ایک شوقین مزاج اور ملازمت کے دلدادہ نوجوان کو فرض اور حق کے راستے پر لگا دیتا ہے، اس کی زوجہ جالپا اس کی تلاش میں الہ آباد سے یہاں آتی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ رما ایک مقدمہ میں پولیس کا مخبر بن گیا ہے تو وہ اس سے خفیہ طور پر ملنے آتی ہے۔ رما پولیس کا مہمان ہے۔ اپنے بنگلے میں آرام سے پڑا ہوا ہے۔ پھاٹک پر سنتری پہرہ دے رہا ہے۔ جالپا کو شوہر سے ملنے سے ناکامی ہوتی ہے۔ تب وہ ایک خط لکھ کر اس کے سامنے پھینک دیتی ہے اور دیبی دین کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ رما یہ خط پڑھتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ وہ چھپ کر جالپا کے پاس آتا ہے۔ جالپا اس سے ساری داستان کہہ سناتی ہے اور اسے اپنا بیان بدل لینے پر مجبور کرتی ہے۔ حکام کو یہ معلوم ہو گیا کہ رما پر غبن کا کوئی الزام نہیں ہے۔ تو وہ جالپا کو گرفتار کرنے کی دھمکی دے کر اسے اپنے ارادے سے باز رکھتے ہیں۔ رما ناتھ کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پولیس کے اختیارات وسیع ہیں۔ مجبور ہو کر وہ جج کے اجلاس میں اپنے پہلے بیان کی تائید کرتا ہے۔ آخر ملزموں کو سزا ہو جاتی ہے۔ رما ناتھ کی اور خاطر داریاں ہونے لگتی ہیں۔''

اس کے بعد جو واقعات ہوئے، ان کا مختصر ذکر کرنے کے بعد وکیل صفائی نے فرمایا:

''میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے جھوٹی شہادت نہیں دی، لیکن ان حالات اور ترغیبوں پر نگاہ ڈالیے تو اس جرم کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس جھوٹی شہادت کا اگر نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی بے قصور کو سزا مل جاتی تو دوسری بات تھی۔ یہاں تو پندرہ نوجوانوں کی قیمتی جان بچ گئی۔ ملزم نے خود اپنی جھوٹی شہادت کا اقبال کیا ہے کہ اس کی دلیرانہ حق پسندی کا یہی انعام اسے ملنا چاہیے۔ جالپا دیوی کی اصول پروری کیا اسی برتاؤ کی مستحق ہے۔ جالپا ہی اس ڈرامے کی ملکہ ہے۔ اس کی حق پسندی، اس کی فرض پروری، اس کی عصمت اور وفا اس کی بے نفسی غرض کن کن اوصاف کی تعریف کی جائے۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کی حمایت سے اس کا دنیاوی مستقبل کتنا روشن ہو جائے گا۔ ایک حسینہ کے دل کی آرزوئیں ہو سکتی ہیں۔ جالپا کا دل ان سے خالی نہیں ہو سکتا، لیکن وہ حمایت حق کے جوش میں ان ساری تمناؤں کو خیر باد کہتی ہے۔ ایک معمولی عورت میں، جس نے اونچے درجے کی تعلیم نہیں پائی۔ کیا اتنا ایثار اور اتنی روشن طبعی کسی غیبی امداد کا ثبوت نہیں ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں ایسے مقدمات روز نہیں پیش ہوتے۔ شاید آپ لوگوں کو اپنی زندگی میں پھر ایسے مقدمے کی سماعت کا موقع نہ ملے۔ یہاں آپ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہوئے ہیں، مگر اس اجلاس کے باہر ایک بہت بڑی عدالت ہے۔ جہاں آپ کے فیصلے کی جانچ ہوگی۔ آپ کا وہی فیصلہ واجب سمجھا جائے گا، جسے یہ باہر کی عدالت بھی واجب تسلیم کرے۔ وہ عدالت کی موشگافیوں میں نہیں پڑتی، جن میں پڑ کر ہم اکثر گمراہ ہو جایا کرتے ہیں۔ اکثر پانی کا دودھ اور دودھ کا پانی کر بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ جھوٹ سے تائب ہو کر حق کی پیروی کرنے کے لیے کسی کو مجرم ٹھہراتے ہیں تو

آپ دنیا کے سامنے عدل کا کوئی اونچا معیار نہیں رکھتے۔''

سرکاری وکیل نے اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''فرض اور ایثار اپنی اپنی جگہ پر بہت ہی قابل قدر ہیں، لیکن جس آدمی نے عمداً جھوٹی شہادت دی، اس نے قانون کی نگاہ میں اور اخلاق کی نگاہ میں جرم کیا ہے اور سزا کا مستوجب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے الہ آباد میں بے جا صرف نہیں کیا۔ اسے صرف وہم تھا لیکن ایسی حالت میں ایک سچے دوست کا یہ فرض تھا کہ وہ گرفتار ہو جانے پر اپنی صفائی پیش کرتا، نہ یہ کہ اپنی کمینی اغراض کے لیے جھوٹ کا جال پھیلاتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ فعل ناواجب ہے تو آپ اسے سزا ضرور دیں۔''

فریقین کے وکیلوں کی بحث ختم ہو جانے کے بعد جج نے سینئرز سے مشورہ کیا اور یہ تجویز سنائی:

''مقدمہ صرف یہ ہے کہ ایک نوجوان نے اپنے کو الزام سے بری کرنے کے لیے پولیس کی پناہ لی اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ جس بنا پر وہ پولیس کی حمایت کرتا ہے، اس کی کوئی ہستی نہیں، تو وہ اپنا بیان واپس لے سکتا ہے۔ رماناتھ اگر حق پرور ہوتا تو ہو پولیس کی حمایت میں جاتا ہی کیوں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ پولیس نے ایسی جھوٹی شہادت دینے کی ترغیب دی۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ شہادت کی تحریک رماناتھ کی جانب سے ہوئی۔ اسے ترغیب دی گئی اور سزا کے خوف سے اس نے اسے منظور کر لیا۔ اسے اس بات کا یقین بھی دلایا گیا ہو گا کہ جن لوگوں کے خلاف شہادت دینے کے لیے اسے آمادہ کیا جا رہا ہے، وہ فی الواقع خطاوار

تھے، کیونکہ رمانا تھ میں اگر سزا کا خوف ہے تو احساس حق بھی ہے۔ وہ ایسے پیشہ ور گواہوں میں سے نہیں ہیں، جو اپنے مفاد کے لیے جھوٹی شہادتیں دیا کرتے ہیں۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو رما اپنی بیوی کے اصرار پر اپنا بیان تبدیل کرنے پر بھی کبھی راضی نہ ہوتا۔ اس لیے میں اسے بری کرتا ہوں۔"

(52)

چیت کی سہانی فرحت بخش شام۔ گنگا کا کنارہ ٹیسوؤ سے لہلہاتا ہوا ڈھاک کا میدان۔ ایک برگد کا چھتنار درخت۔ اس کے نیچے بندھی ہوئی گائے بھینس۔ کدو اور لوکی کی بیلوں سے لہراتی ہوئی جھونپڑیاں۔ نہ کہیں گرد و غبار نہ شور و غل۔ آرام و سکون کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے؟ نیچے سنہری گنگا، سرخ، سیاہ اور نیلے رنگوں سے چمکتی ہوئی میٹھے سروں میں گاتی کہیں لپکتی، کہیں جھجکتی، کہیں شوخ اور کہیں متین اس طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہے گویا بے فکریوں کا خوشنما بچپن ہنستا کھلیا چلا جاتا ہو۔

دیبی دین اور رمانا تھ نے یہیں سکونت اختیار کی۔

تین سال گزر گئے ہیں۔ اسی اثنا میں دیبی دین نے زمین خریدی۔ باغ لگایا، کھیتی جمائی۔ مویشی جمع کیے اور مسلسل جدوجہد میں آرام و سکون کا لطف اٹھا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر اب وہ زردی اور جھریاں نہیں ہیں، بلکہ ایک نئی رونق نظر آ رہی ہے۔

شام ہوگئی۔ مویشی چراگاہ سے لوٹے۔ جگو نے انہیں کھونٹے سے باندھا اور تھوڑا تھوڑا بھوسہ لا کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ دیبی دین اور گوپی بھی بیل گاڑی پر پولے لادے ہوئے آ پہنچے۔ رما ناتھ نے برگد کے نیچے زمین صاف کر رکھی ہے، وہیں پولے اتار لیے گئے۔ یہی اس چھوٹی سی بستی کا کھلیان ہے۔ دیا ناتھ نوکری سے برخاست ہو گئے ہیں اور اب دیبی دین کے اسسٹنٹ ہیں۔ ان کو اخباروں سے اب بھی وہی عشق ہے۔ روز کئی اخبار آتے ہیں اور شام کو فرصت پانے کے بعد منشی جی اخباروں کو پڑھ کر سناتے اور سمجھاتے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں کے دس پانچ آدمی روز جمع ہو جاتے ہیں۔ روز ایک چھوٹی موٹی سبھا ہوتی ہے۔ رما کو تو اس زندگی سے اتنی دل بستگی ہوگئی ہے کہ اب اسے شاید تھانیداری ہی نہیں، چونگی کی انسپکٹری بھی مل جائے تو وہ ملازمت کا نام نہ لے۔ روز صبح اٹھ کر گنگا اشنان کرتا ہے اور دن نکلتے نکلتے اپنے شفاخانہ میں آ بیٹھتا ہے۔ اس نے طب کی دو چار کتابیں پڑھ لی ہیں اور چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کر لیتا ہے۔ دس پانچ مریض روز آتے ہیں اور اس کی شہرت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں سے فرصت پا کر اپنے باغ میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کچھ ساگ بھاجی لگی ہوئی ہے۔ کچھ پھل پھولوں کے درخت ہیں۔ ابھی تو باغ سے محض ترکاری ملتی ہے لیکن امید ہے کہ تین چار سالوں میں پھلوں کی کافی مقدار پیدا ہونے لگے گی۔

دیبی دین نے بیلوں کو گاڑی سے کھول کر کھونٹے سے باندھ دیا اور دیا ناتھ سے بولا:

''ابھی بھیا نہیں آئے؟''

دیاناتھ نے جواب دیا: ''ابھی نہیں۔ مجھے تو اب بہو کے اچھے ہونے کی امید نہیں ہے۔ زمانے کا پھیر ہے کتنے آرام سے رہتی تھیں اور آج یہ حال ہے کہ وکیل صاحب نے اچھی جائیداد چھوڑی تھی مگر بھائی بھتیجوں نے سب ہڑپ کر لی۔''

دیبی: ''بھیا کہتے تھے عدالت میں مقدمہ کرتی تو سب مل جاتا، مگر کہتی ہے میں عدالت میں جھوٹ نہ بولوں گی۔''

یکایک جاگیشری ایک بچے کو گود میں لیے جھونپڑے سے نکلی اور بچے کو دیاناتھ کی گود میں دیتی ہوئی بولی: ''مہتو ذرا چل کر رتن کو دیکھو۔ جانے کیسی ہوئی جاتی ہے۔ زہرہ اور بہو دونوں رو رہی ہیں۔''

دیبی دین نے منشی جی سے کہا: ''چلو لالہ دیکھیں۔''

جاگیشری بولی: ''یہ جا کر کیا کریں گے۔ بیمار کو دیکھ کر تو آپ ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔''

دیبی دین نے رتن کی کوٹھڑی میں جا کر دیکھا۔ رتن باس کی ایک کھاٹ پر پڑی تھی۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ وہ سورج مکھی کا سا کھلا ہوا چہرہ مرجھا کر زرد ہو گیا تھا۔ وہ دل نواز مستی اور مسرت میں ڈوبا ہوا نغمہ فضا میں غائب ہو گیا تھا۔ صرف اس کی یاد باقی تھی۔ زہرہ اس کے اوپر جھکی ہوئی اسے دردناک اور مجبور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ آج سال بھر سے اس نے رتن کی تیمارداری میں اپنے تئیں قربان کر دیا تھا۔ رتن نے اس کے ساتھ جو محبت آمیز برتاؤ کیا، اس بے اعتباری اور حقارت کے ماحول میں جس خلوص اور دلیری کے ساتھ بہنا پا چوڑا تھا، اس کا احسان وہ اور

کس طرح مانتی۔ جو ہمدردی اسے جالپا سے بھی نہ ملی، وہ رتن نے عطا کی۔ اس دوستی میں اس کے دل محروم نے شوہر کا سکھ پایا اور اولاد کا بھی۔

دیبی دین نے رتن کے چہرے کی طرف فکرمند نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا:

''کتنی دیر سے نہیں بولیں؟''

جالپا نے آنکھیں پونچھ کر کہا: ''ابھی ابھی تو بول رہی تھیں۔ یکایک آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور بے ہوش ہو گئیں۔''

زہرہ نے پوچھا: ''کیا بابو جی ابھی وید کو لے کر نہیں لوٹے؟''

دیبی دین نے آہستہ سے کہا: ''ان کی دوا اب وید کے پاس نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے تھوڑی سی راکھ لی۔ رتن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ منہ ہی میں بدبدایا اور چٹکی راکھ اس کے ماتھے پر لگا دی۔ تب پکارا ''رتن بیٹی آنکھیں کھولو۔''

رتن نے آنکھیں کھول دیں اور دھر ادھر وحشت آمیز انداز سے دیکھ کر بولی:

''میرا موٹر آیا تھا نا؟ کہاں گیا وہ آدمی؟ اس سے کہہ دو تھوڑی دیر بعد لائے۔ زہرہ! آج میں تمہیں اپنے باغیچہ کی سیر کراؤں گی۔ ہم دونوں جھولے پر بیٹھیں گے۔''

زہرہ پھر رونے لگی۔ جالپا بھی سیلاب اشک کو نہ روک سکی۔ رتن ایک لمحہ تک چھت کی طرف تاکتی رہی اور پھر یکایک اس کا حافظہ بیدار ہو گیا۔ شرمندہ ہو کر ایک غمناک تبسم کے ساتھ بولی:

''میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔''

سرخ آسمان پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت موت نے رتن کی زندگی پر

پردہ ڈال دیا۔

رمانا تھ وید جی کو لے کر پہر رات کو لوٹے تو یہاں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رتن کی موت کا غم وہ غم نہ تھا، جس میں انسان ہائے ہائے کرتا ہے۔ بلکہ وہ غم جس میں آہیں خاموش ہو جاتی ہیں، جس میں آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں اور جو روح پر ہیبت کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

رتن کے بعد زہرہ اکیلی رہ گئی۔ دونوں ساتھ ساتھ سوتی تھیں۔ ساتھ بیٹھتی تھیں۔ ساتھ کام کرتی تھیں۔ اب زہرہ کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ کبھی دریا کے کنارے جا کر رتن کو یاد کرتی اور روتی۔ کبھی اس کے آم کے پودے کے پاس جا کر گھنٹوں کھڑی رہتی، جسے ان دونوں نے لگایا تھا۔ گویا سہاگ لٹ گیا۔ جالپا کو بچے کی پرورش و پرداخت اور گھر کے کام کاج سے اتنی فرصت نہ ملتی کہ اس کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھتی اور یہ بھی ایک طرح سے اچھا تھا، کیونکہ جب دونوں ساتھ ہوتیں تو رتن کا ذکر آ جاتا اور دونوں رونے لگتیں۔

بھادوں کا مہینہ تھا۔ عناصر کا معرکۂ کارزار گرم تھا۔ بحری فوجیں ہوائی جہازوں پر چڑھ کر آبی تیروں کی بارش کر رہی تھیں۔ زمین اس پر دوش سے عاجز آ کر گوشۂ عافیت تلاش کرتی پھرتی تھی۔ گنگا گاؤں اور قصبوں کو نگل رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں بہتے چلے جاتے تھے۔ زہرہ ندی کے کنارے بیٹھی سیلاب کی خانہ براندازیوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ الغر اندام گنگا اتنی جسیم اور مہیب ہو سکتی تھی، اس کا وہ قیاس بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسی گنگا میں وہ ایک ہلکی سی ڈونگی میں بیٹھ کر جل بہار کیا کرتی تھی۔ آج اس میں پہاڑ کا بھی پتا نہ لگے گا۔ لہریں جنون کے عالم میں

گزرتیں۔ منہ سے پھیں نکالتی، بلیوں اچھل رہی تھیں کبھی لپک کر آگے آ جاتیں، پھر پیچھے لوٹ پڑتیں اور چکر کھا کے آگے دوڑتیں۔ کہیں جھونپڑا ڈگمگاتا تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ گویا کوئی شرابی دوڑا جاتا ہو۔ کہیں کوئی درخت ڈال پتوں سمیت ڈوبتا اترا تا کسی دور حجر کے کوہ قامت جاندار کی طرح تیرتا چلا جاتا تھا۔ گائے، بھینسیں، کھاٹ کھٹولے، طلسمی تصویروں کی طرح آناً فاناً آنکھوں کے سامنے سے نکل جاتے تھے اور ایک بار غائب ہو کر ایک فرلانگ کے بعد پھر نکل پڑتے تھے۔

دفعتاً ایک کشتی نظر آئی۔ اس پر کئی مرد عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹھے کیا چمٹے ہوئے تھے۔ کشتی زیر و زبر ہو رہی تھی۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب الٹی اب الٹی، مگر واہ ری ہمت مردانہ سب کے سب اب بھی گنگا ماتا کی جے کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ عورتیں اب بھی گنگا کے گیت گا رہی تھیں۔ مرگ و حیات کی کشمکش کا کتنا ہیبت ناک نظارہ تھا۔ دونوں طرف کے آدمی سینوں پر ہاتھ رکھے شدت سکون کی حالت میں کھڑے تھے۔ جب کشتی کروٹ لیتی تو لوگوں کے دل اچھل اچھل کر لبوں تک آ جاتے۔ رسیاں پھینکنے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر وہ ساحل سے تھوڑی دور ہی گر پڑتی تھیں۔ یکا یک ایک بار کشتی الٹ گئی۔ وہ سب ہستیاں بحر فنا میں غرق ہو گئیں۔ یک لمحے تک مرد و عورت ڈوبتے نظر آئے۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایک سفید سی چیز ساحل کی طرف چلی آ رہی تھی۔ ایک ہی ریلے میں وہ ساحل سے کوئی تیس گز قریب آ گئی۔ اب معلوم ہوا کوئی عورت ہے۔ زہرہ، جالپا اور رمانا تھ تینوں ہی آ پہنچے تھے۔ عورت کی گود میں ایک بچہ بھی نظر آ رہا تھا۔ دونوں چشم زدن میں کہاں سے کہاں جا پہنچیں گے۔ انہیں کیسے گنگا سے نکال

لیا جائے۔ تینوں ہی بے تاب تھے۔ تینوں بیکسانہ اضطراب سے اس عورت کی طرف دیکھتے تھے اور دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے۔ عورتیں معذور تھیں۔ رماناتھ تیرنا جانتا تھا، لیکن لہروں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں لہروں کے زور میں پاؤں اکھڑ جائیں تو خلیج بنگال کے سوا اور کہیں ٹھکانہ نہ لگے۔

زہرہ نے بے صبر ہو کر کہا: ''ابھی دونوں زندہ ہیں۔''

جالپا: ''سچ؟''

اور وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں پانی میں چل پڑی۔

رماناتھ نے شرمندہ ہو کر کہا: ''تم کہاں جاتی ہو زہرہ۔ تیار۔ تو میں بھی تھا لیکن وہاں تک پہنچ بھی سکوں گا، اس میں شک ہے۔ دیکھتی نہیں ہو پانی میں کتنا توڑ ہے؟''

زہرہ گھٹنے تک پانی میں جا پہنچی تھی۔ بولی: ''نہیں تم نہ آنا۔ خدا کے لیے میں ابھی نکالے لاتی ہوں۔''

وہ کمر تک پانی میں پہنچ گئی۔ رماناتھ گھبرا کر بولا: ''کیوں ناحق جان دیئے جاتی ہو زہرہ؟ خدا کے لیے لوٹ آؤ۔ ٹھہرو میں آتا ہوں۔''

زہرہ نے ہاتھوں سے منع کرتے ہوئے کہا: ''نہیں نہیں تمہیں میری قسم تم نہ آنا۔ میں ابھی لیے آتی ہوں۔ مجھے کچھ کچھ تیرنا آتا ہے۔''

جالپا نے کہا: ''لاش ہوگی اور کیا۔''

رما بولا: ''شاید ابھی جان ہو۔''

جالپا: ''اچھا زہرہ تیر بھی لیتی ہے۔ جبھی ہمت پڑی۔''

رما نے زہرہ کی طرف فکرمند نظروں سے دیکھ کر کہا: ''ہاں کچھ کچھ جانتی تو ہے، مگر لوٹ آئیں تو کہیں مجھے اپنی پست ہمتی پر شرم آ رہی ہے۔''

جالپا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: ''اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ مردہ اماش کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنا کون سی عقلمندی ہے۔''

رما نے اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے کہا: ''یہاں سے کون جان سکتا ہے زندہ یا مردہ۔ واقعی بال بچوں والا نامرد ہو جاتا ہے۔ میں کاٹھ کے الو کی طرح کھڑا رہا اور زہرہ چلی گئی۔''

زہرہ ہاتھ پیر مارتی اماش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اتنے میں ایک رو آئی اور اماش کو پھر ساحل سے کھینچ لے گئی۔ زہرہ خود اس کی زد میں آ گئی اور کئی ہاتھ بہاؤ کی طرف چلی گئی۔ وہ پھر سنبھلی اور ایک دوسرے ریلے نے پھر اسے دھکیل دیا۔ وہ کسی طرح نہ سنبھل سکی۔ اس نے چیخ ماری اور پانی میں سما گئی۔

رما بے تاب ہو کر پانی میں کود پڑا۔ اور زور زور سے پکارنے لگا۔ ''زہرہ، زہرہ میں آتا ہوں۔''

مگر زہرہ میں اب لہروں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ پھر باہر نکلی، مگر ایک فرلانگ پر وہ بہی جا رہی تھی۔ اس کے اعضا میں کوئی بھی حرکت نہ تھی۔

یکا یک ایک ایسا ریلا آیا کہ وہ بیچ دھار میں جا پہنچی۔ اب صرف اس کے سر کے بال نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی صرف ایک لمحے تک۔ پھر وہ نشان بھی غائب ہو گیا۔ یہی اس کا آخری دیدار تھا۔

رما ایک سو گز تک ہاتھ پاؤں مارتا لہروں کا سامنا کرتا ہوا گیا لیکن اتنی سی دور

میں اس کا دم پھول گیا۔ اب آگے کہاں جائے۔ زہرہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہی آخری جھلک آنکھوں کے سامنے تھی۔

کنارے پر جالپا کھڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی پانی میں گھسی۔ رما اب آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک طاقت آگے کھینچتی تھی۔ دوسری پیچھے۔ آنے کی طاقت میں مایوسی تھی۔ قربانی تھی، وفا تھی، پیچھے کی طاقت میں فرض تھا۔ بندش تھی اور زندگی کی امیدیں تھیں۔ بندش نے روک لیا وہ لوٹ پڑا۔

کئی منٹ تک جالپا اور رما گھٹنوں تک پانی میں کھڑے اسی طرف تاکتے رہے۔ رما کی زبان تاسف نے بند کر رکھی تھی۔ جالپا کی غم نے۔

آ کر رما نے کہا: ''پانی سے نکل چلو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

جالپا پانی سے باہر نکل کر کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ پر منہ سے کچھ نہ بولی۔ موت کے اس طمانچے نے اس کے حواس کو مفلوج سا کر دیا تھا۔ زندگی کی حبابی کیفیت زندگی میں دوسری بار اس کی نظروں کے سامنے آئی۔ اس کی موت کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا۔ معلوم تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کی مہمان ہے، مگر زہرہ کی موت تو بجلی کی چوٹ تھی۔ ابھی آدھ گھنٹے پہلے تینوں آدمی روانی دریا کا تماشا دیکھنے خوش خوش چلے تھے۔ کون جانتا تھا کہ موت انہیں اپنی بے دردیوں کا تماشا دکھانے کے لیے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ ان چار برسوں میں زہرہ نے اپنی خدمت، بے نفسی اور پر انکسار و اخلاق سے سبھی کو گرویدہ کر لیا تھا۔ اپنے ماضی کی یاد کو دل سے مٹانے کے لیے۔ اپنے پچھلے داغوں کو دھو ڈالنے کے لیے اس کے پاس اس کے سوا اور کیا ذریعہ تھا۔ اس کی ساری خواہشیں اور ساری مسرتیں اسی جوش خدمت کے لیے جذب ہو گئی

تھیں۔ کلکتہ میں وہ خط نفس اور تفریح کی چیز تھی۔ سبھی اس کے ساتھ گھر کے آدمی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ منی، دیا ناتھ اور جاگیشری کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ وہ دیبی دین کی بیوہ بہو ہے۔ زہرہ نے کلکتہ میں جالپا سے محض اس کے ساتھ رہنے کی التجا کی تھی، مگر اس کا دل ترازوؤں سے خالی نہ تھا۔ جالپا کے خلوص اور بہناپے نے اسے تہذیب نفس کی جانب مائل کر دیا تھا۔ رتن کی پاکیزہ اور بے غرض زندگی اسے روز بروز ایثار کی طرف لیے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رما بھی پانی سے نکلا اور ماتم میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ اس کے بعد اکثر وہ اور جالپا ندی کے کنارے آ بیٹھتے اور جہاں زہرہ ڈوبی تھی وہاں گھنٹوں دیکھا کرتے۔ کئی دنوں تک انہیں امید ہو رہی تھی کہ شاید زہرہ کہیں بچ گئی ہو اور کسی طرف سے ہنستی ہوئی چلی آئے۔ رفتہ رفتہ امید کا جھلملاتا ہوا چراغ بھی یاس کی تاریکی میں فنا ہو گیا۔ ہاں ابھی تک زہرہ کی وہ پاکیزہ صورت ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ اس کے لگائے ہوئے پودے اس کی پالی ہوئی بلی۔ اس کے ہاتھوں سلے ہوئے کپڑے۔ یہ سب اس کی یادگاریں ہیں، جو خیال کو اس کے وجود کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔

The End ختم شد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔